اسلام
اور
مغرب
ظفراللہ خان

اسلام اور مغرب

ظفراللہ خان

کتاب نگر حسن آرکیڈ ملتان کینٹ

انتساب

فاطمہ اور اُم فاطمہ کے نام

پیش لفظ

یہ دو مضامین میرے تین سالہ (98–1995ء) قیام برطانیہ کے مطالعہ و مشاہدہ کا نتیجہ ہیں۔ پہلے مضمون ""اسلام اور مغرب"" میں اس مسئلہ پر بحث کی گئی ہے کہ عمومی اور سماجی مسائل کے حوالے سے مغرب میں ابھی بھی ان کے دعویٰ کے برعکس گہرے نقائص پائے جاتے ہیں جبکہ مسلمان معاشرے بہت سی انسانی اقدار میں ابھی بھی مغربی معاشرے سے بہتر ہیں۔ دوسرے مضمون "پردہ اور مغربی اقدار" میں عمرانیات اور قانون کے حوالے سے پردہ کے بارے میں اہل مغرب کے رویوں پر بحث کی گئی کہ مغرب اپنی اعلان کردہ آزادی خیال کے برعکس تعلیم یافتہ مسلمان خواتین کو اپنی مرضی سے اپنی ثقافتی علامات اختیار کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

ان مضامین سے یہ تاثر لینا بے جا ہوگا کہ موجودہ مسلمان معاشرے بالکل صحیح ہیں یا مغربی معاشرے بالکل غلط ہیں۔ میری سوچی سمجھی رائے ہے کہ ہم اعلیٰ تعلیمات کے حامل ہونے کے باوجود بہت سے پہلوؤں سے معاشرے کی معاشی اور سماجی تنظیم کے حوالے سے کچھ حد تک پس ماندہ ہیں جبکہ اہل مغرب نے اس ضمن میں خاصی ترقی کی ہے، لیکن مغرب کی یہ سوچ بھی بالکل غلط ہے کہ مسلمان معاشرے جاہل، ظالم اور فرسودہ ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ مسلمان اور اہل مغرب غیر متعصب طریقے سے ایک دوسرے کے انسانی تجربات سے سیکھیں تاکہ انسانیت کا ارتقاء بہتر طریقے سے ہو سکے۔

ظفر اللہ خان

اسلام اور مغرب

آج میں نے تمہارے لیے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنا انعام
بھرپور کر دیا اور تمہارے لیے اسلام کے دین ہونے پر رضامند ہو گیا

(سورۃ المائدہ: آیت 3)

مصنف	ظفراللہ خان
سن اشاعت	2000ء
کمپوزنگ	آزاد کمپوزنگ سنٹر: 7597988
پرنٹرز	کتاب نگر حسن آرکیڈ ملتان کینٹ
قیمت	25 روپے

تعارف

اہل مغرب اپنی سیکولر' روشن خیال اور جمہوری معاشرے کے مقابلے میں اسلامی معاشرے کو پس ماندہ اور غیرانسانی سمجھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ خیال سراسر غلط فہمی پر مبنی ہے۔ اسلام صرف ایک مذہب نہیں بلکہ ایک تہذیب ہے اور رحم دل تہذیب ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بعض پہلوؤں سے اسلامی معاشرے' مغربی معاشرے سے چند دہائیاں پیچھے ہیں لیکن ترقی کی جو شاہراہ مغرب نے اختیار کی ہے وہ بھی سارے انسانی مسائل کا حل پیش نہیں کر سکی۔ اصل سوال یہ ہے کہ ایسا کون سا راستہ ہے جو بدترین نتائج کے بغیر عام انسان کو اعلیٰ زندگی دے سکتا ہے؟ اس ضمن میں اسلامی اقدار پر سنجیدہ توجہ کی ضرورت ہے۔

مغربی معاشرہ میں بھی اقدار مستقل نہیں ہیں بلکہ تیزی سے بدل رہی ہیں۔

مثال کے طور 1960ء سے پہلے ہم جنس پرستی غیرقانونی تھی اب اس کی اجازت ہے۔ دوسرے یورپ میں سزائے موت ختم کردی گئی ہے جبکہ امریکہ میں اس کا دائرہ وسیع ہو رہا ہے۔ لیکن جلد ہی امریکہ میں بھی اسے حقوق انسانی کے خلاف قرار دے دیا جائے گا۔

عورتوں کے حقوق

مغرب اسلام کو عورتوں کے حقوق کے ضمن میں پس ماندہ سمجھتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اسلامی اقدار کی غلط تفہیم مسائل پیدا کر رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے بہت سے حقوق عورتوں کو مغرب سے بہت پہلے دیئے ہیں۔ مثال کے طور پر

1۔ برطانیہ میں عورتوں کو جائیداد رکھنے کا حق 1870ء میں ملا ہے جبکہ مسلمان عورتیں چودہ سو سال سے یہ حق استعمال کر رہی ہیں۔

2۔ مغرب میں چند دہائیاں قبل تک ساری جائیداد بڑے بیٹے کو ملتی تھی جبکہ

اسلام اسے چودہ سو سال پہلے ناجائز قرار دے چکا ہے۔

3- فرانس اور سوئٹزر رلینڈ نے عورتوں کو الیکشن میں ووٹ کا حق بالترتیب 1944ء اور 1971ء میں دیا ہے جبکہ افغانستان' ایران' عراق اور پاکستان میں مسلمان عورتیں 50 سال سے یہ حق استعمال کر رہی ہیں۔

4- مزید برآں مغرب کی سب سے مضبوط قوم "امریکہ" میں آج تک کوئی عورت صدر نہیں بن سکی جبکہ تین مسلمان ممالک (پاکستان' بنگلہ دیش اور ترکی) میں مسلم خواتین وزیراعظم رہ چکی ہیں۔ بنگلہ دیش میں آج بھی مسلم خاتون وزیراعظم ہے۔

سنسر شپ

اکثر مسلم ممالک کو سنسر شپ پر مطعون کیا جاتا ہے۔ مثلاً سلمان رشدی کی کتاب "شیطانی آیات" کے بارے میں مسلمان ممالک کے رویہ پر اہل مغرب نے بہت برہمی کا مظاہرہ کیا ہے۔ اگر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مغربی ممالک میں بھی وسیع پیمانے پر سنسر شپ پائی جاتی ہے مگر اس کا طریق کار مختلف ہے۔

1- مغربی ممالک جوں جوں سیکولر ہوئے ہیں توں توں انہوں نے پاکیزگی کے نئے بت بنالیے ہیں۔ بیسویں صدی کے آخر میں ان کے نزدیک فن کی آزادی مذہب سے زیادہ پاکیزہ قرار پائی ہے جبکہ مسلمان اس کتاب کو فن کی آزادی سے زیادہ مذہب کی توہین بلکہ گالیوں کا پلندہ سمجھتے ہیں جس میں پیغمبر اسلام اور ان کی پاکیزہ بیویوں کے خلاف سخت نازیبا زبان استعمال کی گئی ہے۔ مسلمان سمجھتے ہیں کہ رشدی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اسلام کے اعلیٰ ترین افراد کے بارے میں اتنے گندے اور فحش الفاظ استعمال کرے۔

2- مسلمان سمجھتے ہیں کہ گالی اور فن میں فرق ہوتا ہے۔

3- یہ کتاب مسلم ممالک میں فسادات کے خوف سے سنسر کی گئی۔ حکومت انڈیا نے اس کتاب پر پابندی لگاتے ہوئے یہ جواز دیا کہ یہ کتاب مذہبی جذبات کو بھڑکائے گی۔

4- برطانوی ناشر نے اس انتباہ کے باوجود یہ کتاب چھاپی جس کے نتیجے میں ممبئی' اسلام آباد اور کراچی میں بلوہ ہوا جس میں 15 سے زیادہ افراد مارے گئے جبکہ مغربی ممالک میں یہ بات عام ہے کہ فسادات کے خوف کی وجہ سے کتابیں نہیں چھاپی جاتی۔ کیمبرج یونیورسٹی پریس نے Anastasia Karakasidou کی کتاب Fields of Wheat, River and Blood. جو یونان کے علاقے میکڈونیا کے باشندوں کے بارے میں تھی۔ یہ کہہ کر نہیں چھاپی کہ اس سے یونان میں کمپنی کے ملازمین کی جان کو خطرہ ہوگا۔ اگر برطانوی ناشر جنوبی ایشیا کے 15 مرنے والوں کا خیال رکھتا جیسا کہ اسے آزادی اظہار کا خیال ہے تو وہ یہ کتاب نہ چھاپتا۔

5- مغربی ممالک میں بھی سنسر شپ اتنی ہے جتنی کہ مسلم ممالک میں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ٹارگٹ' وسائل اور طریقہ کار مختلف ہے۔ مسلم ممالک کا طریقہ کھردرا ہے جبکہ مغربی ممالک کا طریقہ زیادہ Polished ہے۔ مغربی ممالک میں سنسر شپ کو مالی وسائل' پریشر گروپس' ایڈیٹرز' پبلشرز کی معرفت کنٹرول کیا جاتا ہے۔

6- امریکہ میں سنسر آئین اور قانون کی بجائے غیر حکومتی سطح پر کیا جاتا ہے۔ یہودیوں کے بارے میں "ریمارکس" ٹی وی' ریڈیو وغیرہ کے پروگراموں میں مصنفین کی اجازت کے بغیر خارج کر دیئے جاتے ہیں۔ کارل برنسٹن' باور ڈالیٹ' اریکا جونگ اور پیٹراس جیسے معتبر مصنفین اس طرح کے سنسر شپ کے خلاف آواز بلند کر چکے ہیں۔

7- امریکہ کی مشہور "ویسٹ ویو پریس" نے جناب علی مزوری کی کتاب

Cultural Forces in World Politics کے وہ تین باب چھاپنے سے انکار کر دیا جن میں انہوں نے "شیطانی آیات" (رشدی کی کتاب) کو ثقافتی بغاوت، فلسطینی انتفادہ کو ٹیانمن سکوائر میں 1989ء کی طالب علموں کی بغاوت اور جنوبی افریقہ کی نسل پرست پالیسی Apartheid کو Zoinism سے تشبیہ دی تھی۔

8- اب بھی مغرب میں کسی ایسے آدمی کے لیے جو مارکسزم کو پسند کرتا ہو یا اسرائیل کو تنقید کا نشانہ بناتا ہو، ملازمت (تعلیمی اداروں اور میڈیا وغیرہ میں) حاصل کرنا مشکل ہے۔

9- ٹی وی اور اخبارات پر بھی ایک خاص طرح کے پروگرام پیش کیے جاتے ہیں۔ جبکہ مسلمانوں کا نقطۂ نظر پیش نہیں کیا جاتا۔

اقلیتوں سے سلوک

مغربی ممالک اپنی سیکولر فکر کو ترقی کا راز سمجھتے ہیں اور مسلم ممالک کی مذہبیت کو مسائل کی جڑ سمجھتے ہیں۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ مذہب اور ریاست کی تقسیم میں مغرب اور مسلم ممالک میں کتنا فرق ہے؟

1- مغرب نے سیکولرازم کے ذریعے اقلیتی مذاہب کا دفاع کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر اس کے خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہوئے۔ جرمنی کا Holocaust اس کی بدترین مثال ہے اب بھی مشرقی جرمنی میں یہودیت کے خلاف اور فرانس میں اسلام کے خلاف شدید جذبات پائے جاتے ہیں۔

2- امریکہ میں 200 سال سے مذہب اور ریاست کی تقسیم ہے لیکن پوری تاریخ میں صرف ایک غیر پروٹسٹنٹ (کینیڈی) صدر بن سکا ہے۔

3- یہودی امریکہ میں بہت زیادہ اثر و رسوخ رکھتے ہیں لیکن صدارت کے

لیے انہوں نے بھی کبھی کوشش نہیں کی۔

4۔ کیا امریکہ میں کسی مسلمان کا صدر بننا ممکن ہے؟ یہاں تک کہ وہ وزیر بھی نہیں بن سکتا۔ پچھلے سال جب وائٹ ہاؤس میں عید پر مسلمانوں کو کھانا کھلایا گیا تو وال سٹریٹ جرنل نے اس پر تنقید کی۔

5۔ برطانیہ، فرانس اور جرمنی میں بھی مسلمان خاصی تعداد میں ہیں لیکن تاریخ اب تک اس بات کا انتظار کر رہی ہے کہ کوئی مسلمان وزیر بنے۔

6۔ اسلام نے ہمیشہ اقلیتوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا ہے۔ یہودیوں اور عیسائیوں کو اہل کتاب کی حیثیت سے بہت حقوق حاصل ہیں۔ مسلم سپین میں یہودی عالم بہت اہم عہدوں پر فائز تھے۔

7۔ ترکوں کے زمانے میں بھی غیر مسلموں نے بہت اہم مقامات حاصل کیے۔ سلیمان (1566-1520ء) اور سلیم (1807-1789ء) کی کابینہ میں عیسائی وزیر تھے۔ مغل بادشاہ اکبر کے ہاں ہندو وزیر تھے۔

8۔ اب بھی عراق کے نائب وزیر اعظم جناب طارق عزیز عیسائی ہیں۔ بطروس غالی کبھی بھی اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل نہ بن سکتے اگر وہ مصر میں وزیر خارجہ نہ رہے ہوتے۔ پاکستان میں ہمیشہ ایک اقلیتی وزیر ہوتا ہے۔ مغربی افریقہ کی 95 فیصد مسلم آبادی والی ریاست سینیگال میں ایک عیسائی بیس سال (80-1960ء) صدر مملکت رہے ہیں۔ جناب لیوپولڈ سیدر سیغور کو کبھی بھی عیسائیت کی وجہ سے مسائل کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اب وہاں مسلمان عبدو دیوف صدر ہیں مگر ان کی اہلیہ عیسائی ہیں۔ کیا امریکہ میں کسی صدر کی بیوی مسلمان ہو سکتی ہے؟ اگر کوئی امریکی صدارتی امیدوار ٹی وی پر تسلیم کر لے کہ اس کی بیوی مسلمان ہے کیا وہ پھر بھی الیکشن میں رہ سکے گا؟

ظلم اور پستی

کسی کلچر کو جانچنے کے لیے ہم جہاں یہ دیکھتے ہیں کہ اس نے کیا شاندار کامیابیاں حاصل کی ہیں وہاں یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ اس نے ظلم و بربریت کو کس حد تک روا رکھا ہے؟

1۔ ہم یہ مانتے ہیں کہ بیسویں صدی میں اسلام نے جمہوری قوتوں کو جنم نہیں دیا لیکن دوسری طرف مغربی عیسائی کلچر نے نازی ازم، فاشزم اور کمیونزم کو جنم دیا ہے۔ شام اور عراق میں زیادتیاں ہوئی ہیں لیکن وہاں بھی فاشزم ریاستی نظام نہیں بن سکا۔ البانیہ کے علاوہ کمیونزم کسی بھی مسلم ملک میں فروغ نہیں پا سکا۔

2۔ مسلمان ممالک کو جہاں جمہوریت نہ لانے پر طعن کا نشانہ بنایا جاتا ہے وہاں ان کی تعریف نہیں کی جاتی کہ انہوں نے کس طرح اپنے آپ کو غیر معمولی برائیوں سے بچایا ہے۔ مسلم معاشرہ میں نازی کیمپوں کی مثالیں نہیں ملتیں۔ یورپین کے ہاتھوں امریکہ و آسٹریلیا میں مقامی لوگوں کی تباہی کی مثالیں نہیں ملتیں۔ سٹالن اور پول پاٹ کی مثالیں نہیں ملتیں۔ نسلی امتیاز کی مثال نہیں ملتی جسے ڈچ چرچ نے جواز بخشا۔ جنوبی امریکہ کے نسل پرست کلچر کی مثال نہیں ملتی جہاں ہمیشہ کالے لوگوں پر ظلم کیا جاتا ہے۔

3۔ اسلام نے ہمیشہ نسل پرستی کے خاتمہ Genocide اور تشدد کی مخالفت کی ہے۔ قرآن نے کھل کر نسلی اور قومی مسئلہ پر رائے دی ہے کہ اللہ نے قومیں اور قبائل صرف اور صرف شناخت کے لیے پیدا کیے ہیں اور اچھائی کا معیار تقویٰ ہے۔ حضرت محمد ﷺ نے خطبہ حجتہ الوداع کے موقع پر فرمایا کہ عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر کوئی فوقیت نہیں ہے۔

سرخ آدمی کو سیاہ پر کوئی فوقیت نہیں ہے۔

4- حضرت محمد ﷺ کے غلام ایتھوپیا کے رہنے والے حبشی غلام حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سیدنا بلال (ہمارے سردار) کہہ کے پکارتے تھے۔

5- جدید مصر کے پانچ صدور میں سے دو سیاہ رنگت والے تھے۔ مصر اور ہندوستان میں غلاموں نے حکومتیں کی ہیں۔

6- اسلام میں منتخب زبان (عربی) تو ہے مگر کوئی منتخب قوم نہیں ہے۔ چوتھی صدی عیسوی (313ء) میں رومی بادشاہ کانسٹینٹائن اول کے عیسائی بننے کے بعد سے آج تک عیسائیت پر یورپ کا غلبہ ہے جبکہ مسلمانوں کی قیادت بدلتی رہی ہے۔ عربی اموی حکومت (750-661ء) مخلوط عباسی حکومت (1258-750ء) اور پھر عثمانی سلطنت (1922-1458ء) اس کی مثالیں ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں مغل سلطنت، مصر میں فاطمی حکومت، ایران میں صفوی حکومت اس بات کا ثبوت ہے کہ پوری تاریخ میں کبھی بھی ایک علاقہ کے لوگوں نے مسلم دنیا کی قیادت نہیں کی۔ جبکہ یورپ نے ہمیشہ عیسائی دنیا کی قیادت کی ہے۔ ان متفرق حکومتوں نے مسلم دنیا میں نسلی مساوات کو پھیلایا ہے اسلام کے اس غیر نسلی پالیسی کا نتیجہ ہے کہ کہیں بھی مسلمانوں نے کسی نسل کو ختم کرنے کی کوشش نہیں کی اس کے برعکس اسلام تبلیغ تعاون اور باہمی رشتوں سے پھیلا ہے۔

امن وامان

1- اہل مغرب یہ کہتے ہیں کہ اسلامی بنیاد پرستی دہشت گردی کو جنم دے رہی ہے۔ اگر اسلام مغرب کے مقابلے میں زیادہ سیاسی تشدد پیدا کر رہا ہے تو مغرب اسلام کے مقابلے میں زیادہ شاہراہی تشدد (Street Violence) پیدا کر رہا ہے۔ مغربی معاشرہ اس سے زیادہ "ٹھگ" پیدا کر رہا ہے جتنے

"مجاہدین" اسلام پیدا کر رہا ہے۔ افریقہ میں سب سے بڑا مسلم شہر قاہرہ ہے اور سب سے بڑا مغربی شہر جوہانسبرگ ہے۔ قاہرہ زیادہ بڑا ہے مگر جرائم جوہانسبرگ میں زیادہ ہیں۔

2۔ معیار زندگی کے حساب سے کیا عام شہری سخت اسلامی حکومت میں بہتر ہے یا کہ آزاد مغربی ملک میں؟ تہران کی آبادی ایک کروڑ ہے لیکن عورتیں اور بچے رات کے بارہ بجے آزادی سے پارکوں میں پکنک مناتے ہیں۔ لوگ رات کو بلاخوف و خطر سڑکوں پر چلتے ہیں۔ کیا نیویارک اور واشنگٹن میں یہ ممکن ہے؟ عام ایرانی' حکومت کے دباؤ میں ہے جبکہ عام امریکی شہری دوسرے شہریوں کے دباؤ میں ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ تہران کا سکون آمرانہ حکومت کی وجہ سے ہے ایسا ہوتا تو لاگوس میں امن ہوتا۔

3۔ دنیا کے تمام اخلاقی نظاموں میں اسلام نے بہت زیادہ بیسویں صدی کی مہلک بیماری AIDS کے خلاف رکاوٹ کی ہے۔ جنسی تعلقات میں اعتدال اور نشہ آور ادویات کے استعمال کی کمی نے مسلم معاشرہ کو اس لعنت سے قدرے بچایا ہوا ہے۔ ماہرین کہتے ہیں کہ مسلم ملک آوری کوسٹ میں ایڈز سے متاثر ہونے والے مسلمانوں کی تعداد ایڈز سے متاثر ہونے والے غیر مسلموں سے آدھی ہے۔ (نیو سائنٹفک لندن ستمبر 1993ء)

خلاصہ

مغربی آزاد جمہوریت نے جہاں آزادی' احتساب' عوام کی حکومت اور اعلیٰ معاشی پیداواری ہے وہاں اس کی کوکھ سے نسل پرستی' فاشیت استحصال اور نسل کشی نے جنم لیا ہے۔ انسانیت کو اسلام سے سیکھنا ہے کہ کس طرح نشہ' نسل پرستی' مادیت' شراب نوشی' نازی ازم اور مارکسزم جیسی انسانی فطرت کی خامیوں کو کنٹرول کرنا ہے۔

جمہوری اصولوں اور انسانی اصولوں میں فرق ہے۔ انسانی اصولوں میں مسلم معاشرے دنیا سے آگے ہیں' انسانی مساوات' مستحکم خاندان' عدم سماجی تشدد' غیر نسلی

مذہبی ادارے، اقلیتوں کا احترام جیسے بنیادی انسانی اصول آج کی انسانیت کی اہم ضرورت ہیں۔ مسلمانوں کا فرض ہے کہ اپنے معاملات کو بہتر طور پر چلاتے ہوئے، مغربی دنیا کو حکمت کے ساتھ یہ بتائیں کہ اسلام فی الحقیقت ذاتی اور اجتماعی سلامتی کا دین ہے۔ انسانی ذات کا بنیادی مسئلہ اس وقت تک حل نہیں ہو سکتا جب تک کہ انسان کا ناطہ اس کے مالک سے جوڑ نہ دیا جائے۔

○ ○ ○

پردہ اور مغربی معاشرہ

مسلمان عورتوں سے کہو کہ وہ بھی اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی عصمت میں فرق نہ آنے دیں اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں، سوائے اس کے جو ظاہر ہے اور اپنے گریبانوں پر اپنی اوڑھنیاں ڈالے رہیں، اور اپنی آرائش کو کسی کے سامنے ظاہر نہ کریں، سوائے اپنے خاوندوں کے یا اپنے والد کے یا اپنے خسر کے یا اپنے لڑکوں کے یا اپنے خاوند کے لڑکوں کے یا اپنے بھائیوں کے یا اپنے بھتیجوں کے یا اپنے بھانجوں کے یا اپنے میل جول کی عورتوں کے یا غلاموں کے یا ایسے نوکر چاکر مردوں کے جو شہوت والے نہ ہوں یا ایسے بچوں کے جو عورتوں کے پردے کی باتوں سے مطلع نہیں۔ اور اس طرح زور زور سے پاؤں مار کر نہ چلیں کہ ان کی پوشیدہ زینت معلوم ہو جائے۔

(النور:۳۱)

اے نبی ! اپنی بیویوں سے اور اپنی صاحبزادیوں سے اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دو کہ وہ اپنے اوپر اپنی چادریں لٹکا لیا کریں، اس سے بہت جلد ان کی شناخت ہو جایا کرے گی پھر نہ ستائی جائیں گی، اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔

(الاحزاب:۵۹)

بتولے باش و پنہاں شو از ایں عصر
تا در دامن توئے شبیر بگیرے
(اقبالؒ)

سیدنا فاطمہ رضی اللہ عنہا کے نقش قدم پر چلتے ہوئے
اس زمانے کی نگاہوں سے بچو تاکہ تیرے دامن میں سیدنا
حسین رضی اللہ عنہ کی راہ پر چلنے والے نوجوان پرورش پا سکیں

تعارف

1990ء میں برطانیہ کے ایک شہر الٹرنچم Altrincham کے لڑکیوں کے گرامر سکول کی ہیڈ مسٹرس نے دو مسلمان لڑکیوں کو سکول سے گھر واپس اس لیے بھیج دیا کہ وہ حجاب کر کے آئی تھیں۔ مسلمان تنظیموں اور ذرائع ابلاغ کے شدید دباؤ کے سبب سکول کے بورڈ آف گورنرز نے ایک ہفتہ کے اندر اندر ہیڈ مسٹرس کا فیصلہ تبدیل کر دیا۔ اس طرح کے معاملات فرانس، بلجیئم، جرمنی اور ہالینڈ میں پیش آتے رہتے ہیں۔ اس مضمون میں ہم اس مسئلہ کا جائزہ لیں گے کہ برطانوی معاشرے اور قانون نے مسلمان اقلیت کے لیے اس اہم مسئلہ کے بارے میں کیا رویہ اختیار کیا ہے؟

برطانیہ میں مسلمانوں کی اصل آبادی معلوم کرنا قدرے مشکل کام ہے اس لیے کہ برطانوی مردم شماری کے فارم میں مذہب سے متعلق سوال شامل نہیں۔ اس لیے ماہرین شہریوں کے وطن پیدائش اور قومیت وغیرہ کی بنیاد پر اندازے لگاتے ہیں۔ ایک معتبر اندازے کے مطابق 1991ء میں برطانیہ میں مسلمانوں کی آبادی تقریباً دس لاکھ سے پندرہ لاکھ کے درمیان تھی (محمد انور: برطانیہ میں مسلمان۔ 1991ء) مسلمان آبادی کا نصف جنوبی ایشیاء سے تعلق رکھتا ہے جبکہ باقی نصف آبادی مشرق وسطی، شمالی افریقہ، سائپرس، ملائشیا، ایران اور سب صحرائی افریقہ سے تعلق رکھتی ہے۔

حجاب

یہاں حجاب سے مراد وہ سکارف ہے جو مسلمان خواتین اور لڑکیاں اپنے سروں پر باندھتی ہیں جس سے ان کا سر اور گردن چھپ جاتی ہے۔ کچھ لوگ اس کو Veil کہتے ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے کیونکہ حجاب پوش خواتین کا چہرہ واضح طور پر نظر آتا ہے۔ اس طرح کے پردہ کے لیے عربی زبان میں لفظ حجاب استعمال ہوتا ہے اور مسلمان خواتین حیاء کی علامت کے طور پر حجاب کرتی ہیں۔

نقطۂ ہائے نظر

مغرب میں اقلیتوں کی ثقافت کے بارے میں دو متضاد نقطۂ ہائے نظر پائے جاتے ہیں۔ جذبیت پسندوں (Assimilationists) کا خیال ہے کہ اقلیت کو چاہیے کہ اکثریت کی ثقافت میں جذب ہو جائے۔ اقلیتوں کو چاہیے کہ وہ اپنی الگ قومیت ختم کر دیں اور وسیع تر اکثریتی سوسائٹی سے اہم آہنگ ہو جائیں۔ جذبیت پسندوں کے دلائل درج ذیل ہیں۔

1۔ اکثر اقلیتیں اہم مغربی اقدار کو جذب نہیں کر سکتیں تو وہ کم از کم قابل قبول رویہ اختیار کریں۔ اس ضمن میں وہ کم عمر بچوں کی شادی اور عورتوں کا ختنہ وغیرہ کو مثال کے طور پر پیش کرتے ہیں۔
2۔ ملکی قانون اگر اقلیتوں کی روایات کے لیے استثناء پیدا کرتا ہے تو اس سے قانون کی نظر میں برابری کا بنیادی اصول خطرے میں پڑ جائے گا۔
3۔ اقلیتیں الگ تشخص پر اصرار کر کے معاشی ہم آہنگی اور ترقی نہیں کر سکتیں۔
4۔ الگ ثقافتی شناخت پر اصرار سے معاشرہ میں تقسیم کا عمل پیدا ہوتا ہے جس سے سماجی یکجہتی اور قومی وحدت جیسے اہم مقاصد متاثر ہوتے ہیں۔

دوسری ثقافتی کثرت پسندوں (Cultural Pluralists) کا خیال ہے کہ مختلف ثقافتوں اور شناختوں کا احترام کرنا چاہیے۔ یہی اس آزاد خیال جمہوریت کا خاصہ ہے جس میں انفرادیت پسندی، شخصی آزادی، انسانی احترام اور رواداری جیسی اقدار کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ ثقافتی کثرت پسند اقلیتوں کی اقدار پر کچھ بندشیں لگانا چاہتے ہیں تاکہ ان پر عمل ان بنیادی اور کم از کم معیاروں کے خلاف نہ ہو جن کو بین الاقوامی قانون تسلیم کرتا ہے۔ ثقافتی کثرت پسندوں کے بنیادی دلائل حسب ذیل ہیں۔

1۔ سماجی انصاف کے حوالے سے اقلیتوں کو مکمل برابری ملنی چاہیے۔ قانون

کو چاہیے کہ اقلیتوں کی اقدار کا اتنا ہی احترام کرے جتنا کہ اکثریتی اقدار کا کرتا ہے۔

2- اکثریت اور اقلیت سے ایک جیسا رویہ نامناسب ہے اس لیے بین الاقوامی قانون اقلیتوں کے بارے میں ایک خاص طرح کا رویہ چاہتا ہے۔

3- کثرت۔ ثقافت سے زندگی میں حسن پیدا ہوتا ہے اس لیے اکثریت کو چاہیے کہ وہ اقلیت کو مجبور نہ کرے کہ وہ معاشی ترقی کے لیے اپنا تشخص ختم کرے۔

4- اکثریت امتیاز تو رنگ کی بنیاد پر کرتی ہے جبکہ ثقافتی فرق کو صرف بہانے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے تاکہ نسلی امتیاز چھپ جائے۔

5- قومی یکجہتی کے حصول کے لیے دوسرے کا احترام اور کثرت اقدار کے لیے رواداری پیدا کرنی چاہیے جس کے لیے ایک جیسا نظام تعلیم' ایک ہی معاشی ماحول میں کام اور سیاسی عمل میں شرکت بہترین ہتھیار ہیں۔

سرکاری پالیسی

برطانیہ کے نو آبادیاتی علاقوں میں سے سب سے پہلے Carribean کے لوگ 1950ء اور 1960ء کی دھائیوں میں یہاں آنا شروع ہوئے: اس وقت پالیسی سازوں کا رجحان جذبیت پسندی کی طرف مائل تھا اس کی اہم وجہ یہ تھی کہ نئے آنے والے لوگوں کا مذہب عیسائی تھا اور زبان انگریزی تھی۔ اس مذہبی اور لسانی وحدت کی وجہ سے یہاں کی اکثریت میں ان کا جذب ہو جانا مشکل نہ تھا۔ مشکلات اس وقت سامنے آنا شروع ہوئیں جب ترک وطن کر کے یہاں آباد ہونے والوں کی اکثریت جنوبی ایشیاء کے باشندوں کی ہونے لگی۔ ان لوگوں کی ثقافتی اقدار مختلف تھیں۔ وہ زبان مختلف بولتے تھے اس کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کا اپنے مذہب' اقدار' ثقافت اور زبان سے خاص لگاؤ تھا: اس بدلتی ہوئی صورتحال کے پیش نظر حکومت کو بھی اپنی فکری پالیسی

تبدیل کرنا پڑی جس کا اظہار پہلی بار 1966ء میں اس وقت کی لیبر حکومت کے وزیر داخلہ رائے جنکنز نے دارالعوام میں تقریر کرتے ہوئے یوں کیا۔ "Integration سے ہماری مراد یہ نہیں ہے کہ اقلیتیں اپنی قومی خصوصیات یا تشخص کھو دیں۔ اس سے ہماری مراد ہے کہ اقلیتیں باہمی رواداری کے ماحول میں مواقع کی برابری کے ساتھ ساتھ اپنی ثقافتی کثرت قائم رکھیں۔"

یہ ثقافتی کثرت کی پالیسی کا پہلا سرکاری اظہار تھا۔ اس کے بعد ہمیشہ ہر آنے والی حکومت اس پالیسی کا مسلسل اظہار کرتی رہی ہے لیکن ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ثقافتی کثرت کی پالیسی ہی حکومت کی پالیسی ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ جذبیت پسندی اور ثقافتی کثرت کی پالیسیاں ساتھ ساتھ چل رہی ہیں۔

حقوق انسانی کا پہلو

برطانیہ بہت سے ایسے بین الاقوامی معاہدوں میں شامل ہے جو اقلیتوں کے تحفظ کے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر حقوق انسانی کا یورپی معاہدہ، شہری اور سیاسی حقوق کا معاہدہ، معاشی، سماجی اور ثقافتی حقوق کا معاہدہ، تعلیم میں عدم امتیاز کا معاہدہ وغیرہ۔ لیکن برطانوی دستوری قانون کے مطابق ابھی تک یہ معاہدے برطانوی قانون کا حصہ نہیں ہیں اس لیے کہ پارلیمنٹ نے ابھی تک ان کو اپنے قانون کا حصہ نہیں بنایا ہے مگر برطانوی عدالتوں نے اپنے فیصلوں میں حقوق انسانی کے یورپی معاہدہ کا حوالہ دینا شروع کر دیا ہے۔ حقوق انسانی کے یورپی معاہدہ کی دفعہ 14 کے تحت اقلیتوں کے مذہب کی بنیاد پر امتیاز کرنا غلط ہے جبکہ شہری اور سیاسی حقوق کے معاہدہ کی دفعہ 27 کے تحت اقلیتوں کو زیادہ تحفظ حاصل ہے اس دفعہ کے الفاظ کچھ یوں ہیں۔ جن ممالک میں نسلی، مذہبی یا لسانی اقلیتیں آباد ہیں ان ممالک کو چاہیے کہ وہ ان اقلیتوں کے ثقافتی، مذہبی اور لسانی حقوق سے انکار نہ کریں۔

اس معاہدہ کی دفعہ 40 کے مطابق ہر مملکت پر لازم ہے کہ وہ وقفے وقفے سے

اقوام متحدہ کی حقوق انسانی کی کمیٹی کے سامنے اس بات کی رپورٹ پیش کرے کہ انہوں نے اس معاہدہ کو عمل میں لانے کے لیے کیا اقدامات کیے ہیں؟ اس طرح کی 1977ء کی رپورٹ میں برطانوی حکومت نے کہا اگرچہ اس بات کی امید ہے کہ آخرکار اقلیتی اکثریت سے ہم آہنگی کرے گی مگر ہم آہنگی سے مراد اکثریت میں جذب ہو جانا ہرگز نہیں اس کے برعکس اس سے مراد باہمی رواداری کے ماحول میں مواقع کی برابری اور ثقافتی کثرت بنے۔

نظام تعلیم

جذب پسندی یا ثقافتی کثرت کی پالیسی اختیار کرنے کے لیے تعلیم کا نظام سب سے زیادہ موزوں و مناسب ہوتا ہے۔ انگلینڈ میں 92 فیصد طالب علم سرکاری سکولوں میں زیر تعلیم ہیں جہاں قومی نصاب لاگو ہے۔ اس کے علاوہ حکومت سات ہزار پرائیویٹ سکولوں کو امداد (Subsidy) دیتی ہے ان اداروں میں زیادہ تر کلیسائے انگلستان Church of England اور رومن کیتھولک سکول ہیں۔ کچھ سکول یہودیوں کے بھی ہیں مگر ابھی تک کسی مسلمانوں کے سکول کو امداد نہیں دی گئی تھی۔ جناب یوسف اسلام صاحب کے شمالی لندن میں قائم کردہ اسلامیہ پرائمری سکول نے طویل جدوجہد کی اور عدالتی کارروائی میں جج جناب میک پرسن کے ہمدردانہ تبصرہ کے باوجود بھی حکومت نے امداد نہیں دی تھی (یوسف اسلام کیس مئی 1992ء) اب 1998ء میں جناب یوسف اسلام کے سکول کو امداد مل گئی ہے اور برطانوی تاریخ میں یہ پہلا مسلم سکول ہے جس کو سرکاری امداد ملی ہے۔

سرکاری سکولوں میں ایجوکیشن ایکٹ 1996ء کی دفعہ 375 کی ذیلی دفعہ 3 کے مطابق مذہبی تعلیم مقامی طور پر متفق شدہ اصولوں کی بنیاد پر ہونی چاہیے۔ یہاں چونکہ زیادہ تر مذہبی روایات عیسائیت کی ہیں اس لیے عیسائی اقدار کے علاوہ علاقہ میں موجود دیگر مذاہب کی تعلیمات کا بھی اظہار ہونا چاہیے۔ جبکہ پرائیویٹ سکول مذہب کے

بارے میں اپنی پالیسی بنانے میں آزاد ہیں۔

نسلی تعلقات کا قانون

برطانیہ کی اعلان کردہ ثقافتی کثرت کی پالیسی اور نسلی تعلقات کے قانون 1976ء کی رو سے لگتا ہے کہ مسلمان لڑکیوں اور خواتین کو قانونی حق ہوگا تاکہ وہ حجاب پہن سکیں اور اس سے متعلق اپنے حقوق کو عدالتوں کے ذریعے نافذ کر سکیں مگر حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ دارالامراء (برطانیہ کی سب سے بڑی عدالت) کے مقدمہ منڈلا بنام ڈول Mandla V Dowell 1983 کی رو سے بھی لگتا ہے کہ مسلمان عورتوں کو حجاب پہننے کا قانونی حق ہے۔ اس مقدمہ میں ایک سکھ لڑکے کا سکول میں پگڑی پہننے کا حق تسلیم کیا گیا ہے اور یہ بھی اعلان کیا گیا ہے کہ سکول میں لڑکے کو پگڑی پہننے کی اجازت نہ دینا غیرقانونی ہے اور نسلی تعلقات کے قانون 1976ء کے خلاف ہے۔ لیکن اگر غور سے دیکھیں تو یہ فیصلہ مسلمانوں کو کوئی فائدہ نہیں دیتا۔

نسلی تعلقات کا قانون نسلی امتیاز کے خلاف ہے مگر مذہبی امتیاز کی بات نہیں کرتا۔ پارلیمنٹ میں قانون بننے کے وقت یہ ترمیم پیش ہوئی کہ مذہبی امتیاز بھی منع ہے مگر یہ ترمیم مسترد کر دی گئی تھی۔ اس قانون کی رو سے قوم نسل اور رنگت وغیرہ کی بنیاد پر امتیاز منع ہے۔ سکھ لڑکے نے مقدمہ اس وجہ سے جیتا کہ سکھوں کو ایک نسل Race قرار دیا گیا لارڈ فریزر نے نسلی گروپ کی شناخت کے لیے دو لازمی جُز قرار دیئے۔

1۔ یہ کہ گروہ کی اپنی ایک طویل اور مشترکہ تاریخ ہونا چاہیے جس کا اس گروہ کو احساس ہو جو اس گروہ کو دوسرے گروہوں سے ممتاز کرے اور یہ گروہ اس تاریخ کو تازہ رکھے۔
2۔ اور اپنی الگ ثقافتی روایات ہوں جس میں خاندانی اور سماجی رسوم اور آداب بھی شامل ہوں۔

اس کے علاوہ انہوں نے پانچ اور عوامل کا بھی ذکر کیا ہے جو اگرچہ متعلق تو ہیں مگر نسلی گروہ کی تشکیل کے لیے لازم نہیں ہیں۔ جس میں جغرافیہ' زبان' ایک ادب اور ایک مذہب وغیرہ شامل ہیں۔ اس معیار کی روشنی میں دارلامراء نے کہا کہ سکھ صرف ایک مذہبی گروہ نہیں ہے بلکہ ایک نسلی اور قومی گروہ ہے۔ اسی طرح دوسرے مقدمات میں یہودیوں اور خانہ بدوشوں تک کو بھی الگ نسلی گروہ قرار دیا جا چکا ہے مگر اب تک کے تمام فیصلہ شدہ مقدمات میں مسلمانوں کو ایک نسل کی بجائے مذہبی گروہ قرار دیا گیا ہے۔ جنوبی لندن کی صنعتی عدالت نے نیازی کیس 1988ء میں کہا کہ مسلمانوں میں بہت سی قوموں اور رنگوں کے لوگ شامل ہیں جو مختلف زبانیں بولتے ہیں مگر ان میں وجہ اشتراک ایک مذہب اور مذہبی ثقافت ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ مسلمان عالمی طور پر اپنے آپ کو ایک نسلی گروہ نہیں مانتے بلکہ اپنے آپ کو ایک مذہبی وحدت (امت) کا حصہ قرار دیتے ہیں۔ اس لیے نسلی امتیاز کا قانون 1976ء مسلمان عورتوں کے حجاب کے حقوق کی حفاظت نہیں کر سکتا۔

نسلی امتیاز کے قانون میں ایک تصور بالواسطہ تفریق ہے جس سے مراد یہ ہے کہ اگرچہ بظاہر پالیسی غیرجانبدارانہ ہے اور کسی خاص گروہ کو نشانہ نہیں بناتی مگر فی الحقیقت اس کا اثر ایک گروہ پر زیادہ پڑتا ہے۔ اس قانون میں دیکھا یہ جاتا ہے کہ وہ اس گروہ کے کتنے فیصد (کتنے تناسب) کو متاثر کرتا ہے۔ سکولوں کے لباس کے بارے میں قوانین خاص طور پر مسلمانوں' سکھوں اور یہودیوں کو متاثر کرتے ہیں مگر حجاب کرنے والی مسلمان خواتین اس تناسب کے معیار (Proportion Test) پر پورے نہیں اترتیں۔ اس لیے نسلی امتیاز کے قانون 1976ء کی یہ دفعہ مسلمانوں کی مدد نہیں کر سکتی۔

مسلمانوں اور سکھوں کے بارے میں برطانوی رویہ میں اختلاف کی اور بھی وجوہات ہیں۔ راج کے زمانے میں سکھ برطانوی فوج میں بہت اہم عہدوں پر فائز تھے اس لیے انگریز ان سے مانوس ہیں۔ اس کے برعکس حجاب کو یہاں عورت اور مرد کے امتیاز کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اسلام کے بارے میں مغرب کا

رویہ تاریخی وجوہ کی بناء پر زیادہ منفی ہے اور اب اسلام کے احیاء کا خوف اس میں شامل ہو گیا ہے۔

الڑنچم گرامر سکول کا معاملہ

1990ء میں الڑنچم کے لڑکیوں کے گرائمر سکول کی ہیڈ ٹیچرس نے دو مسلمان لڑکیوں کو جن کی عمریں چودہ اور پندرہ برس تھیں صرف اس وجہ سے گھر واپس بھیج دیا کہ انہوں نے سکول میں حجاب پہننے پر اصرار کیا تھا۔ ایک سال قبل ان لڑکیوں نے سکول کی انتظامیہ سے حجاب کرنے کی اجازت طلب کی تھی مگر انتظامیہ نے حفاظت اور صحت کی وجوہ پر اجازت دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس پر لڑکیوں کے خاندان والوں نے نسلی مساوات کے کمیشن Racial Equality Commission سے رجوع کیا۔ کمیشن نے والدین کو بتایا کہ بظاہر یہ معاملہ غیر قانونی نسلی امتیاز ہے۔ 1990ء میں اس سکول میں اٹھارہ مسلمان لڑکیاں تھیں۔ سب کو شلوار قمیض پہننے کی جازت دے دی گئی تھی جبکہ صرف ان دو نے حجاب کی اجازت مانگی تھی۔ اس معاملہ پر جب شور اٹھا تو ہیڈ ٹیچرس نے اپنے فیصلے کا مسلسل دفاع کیا کہ حجاب، صحت و حفاظت کے خلاف ہے اور سکول کے لباس کے اصول مقامی کمیٹی نے منظور کیے ہوئے ہیں۔ لیکن ایک ہفتہ کے اندر اندر سکول کے گورنرز نے ہیڈ ٹیچرس کا فیصلہ بدل دیا اور لڑکیوں کو دو شرائط پر حجاب کرنے کی اجازت دے دی کہ

1۔ حجاب کا رنگ سکول کی یونیفارم کے رنگ کا ہو یعنی گہرا نیلا اور یہ کہ
2۔ حجاب اچھی طرح باندھا ہوا ہو اور نیچے سے قمیص میں اڑس لیا جائے۔

اس طرح گورنرز نے جلد یہ ایک عملی حل نکال لیا اور معاملہ عدالت میں جانے سے پہلے حل ہو گیا۔

غیر معقولیت کا اصول

کچھ ماہرین کا خیال ہے کہ حجاب سے متعلق سکولوں کے قوانین کا مقدمہ Wednesbory 1948 میں طے کردہ غیر معقولیت Unreasonableness کے اصول کی روشنی میں چیلنج کیا جا سکتا ہے۔ یہاں سرکاری سکولوں کے ضمن میں عدالت کو اختیار ہے کہ اس مسئلے کی سماعت کر سکے بشرطیکہ والدین یا طالب علم مقدمہ دائر کریں جبکہ پرائیویٹ سکولوں کے معاملات میں عدالت Judicial Review نہیں کر سکتی چونکہ یہ معاملہ پرائیویٹ قانون معاہدہ کے مطابق طے ہوگا۔ عدالت کی دخل اندازی کے لیے ان معاملات میں غیر معقولیت بہت زیادہ ہونی چاہیے۔ ٹیمز سائیڈ کونسل کے مقدمہ 1977ء میں لارڈ رسل نے کہا کہ غیر معقولیت بہت زیادہ ہونی چاہیے جبکہ لارڈ ڈپلاک نے مارگریٹ تھیچر کے مشہور زمانہ مقدمہ GCHQ.1985 (جس میں اس نے جاسوسی کے مرکز کے ملازمین کی یونین پر پابندی لگا دی تھی) میں کہا کہ غیر معقولیت ایسی شدید ہو کہ وہ عام طور پر تسلیم شدہ عقلی اصولوں یا منطق کے ایسے خلاف ہو کہ کوئی بھی عقلمند آدمی اس کو تسلیم نہ کرے یا خود عمل نہ کرے۔ اس لیے سابقہ مقدمات کے فیصلوں کی روشنی میں حجاب کے مسئلہ پر عدالتی نظرثانی کا امکان بہت کم ہے۔

جنسی مساوات

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ حجاب کی اجازت دینا عورت اور مرد کی برابری کے اس بنیادی اصول کے خلاف ہے جو اس مغربی تہذیب کا خاصہ ہے اس کے برعکس حجاب کے حامی لوگوں کا خیال ہے کہ حجاب ظلم کی نشانی نہیں ہے بلکہ یہ عورت کو حقیقی آزادی عطا کرتا ہے۔ انہیں ایک ذاتی اور محفوظ عزت اور ذمہ داری عطا کرتا ہے۔ انہیں مردوں کی ہوس پرستانہ نگاہوں سے بچاتا ہے، نت نئے فیشنوں کے چکر سے آزاد کرتا ہے اور اس کے ذریعے وہ ایک عالمی برادری کا حصہ ہونے کا اعلان کرتی ہے۔

حجاب کرنے والی مسلمان خواتین بیک وقت اپنی برطانوی اور مسلم شناخت کا

علی الاعلان اظہار کرنا چاہتی ہیں اور وہ چاہتی ہیں کہ ان کے اس اظہار کا احترام کیا جائے۔ حجاب کرنے والی اکثر خواتین جدید اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں جو کہ عریانی کو شعوری طور پر خیرباد کہہ کر اپنی آزاد مرضی سے اس معاشرہ میں اپنا الگ تشخص بنانا چاہتی ہیں تاکہ وہ اس معاندانہ معاشرہ میں اپنی اعلیٰ اخلاقی اقدار اور ذاتی عزت نفس کے ساتھ رہ سکیں وہ اپنے علم اور حجاب سے مغربی اور اسلامی ثقافتوں میں امتزاج پیدا کر رہی ہیں۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ کم سن بچوں پر والدین حجاب کے بارے میں سختی کر سکتے ہیں۔ یا بچیاں والدین کی مرضی کے مطابق چلنے کے دباؤ کا شکار ہو سکتی ہیں۔ تو کیا والدین کو بچوں کی تربیت کے حقوق نہیں ہیں؟ بین الاقوامی اور قومی قانون والدین کے اس حق کو تسلیم کرتا ہے۔ حقوق انسانی کے یورپی منشور کی پہلی پروٹوکول کی دفعہ 22 کے تحت والدین کے اس حق کو تسلیم کیا گیا ہے کہ وہ اپنی مذہبی اور اخلاقی اقدار کی روشنی میں بچوں کی تعلیم و تربیت کریں۔ اقوام متحدہ کے بچوں کے حقوق کے کنونشن کی دفعہ 5 اس سے بھی زیادہ واضح ہے۔ بچے کی تعلیم بچے اور اس کے والدین کی ثقافتی شناخت' زبان' اقدار اور جہاں کا رہائشی ہے وہاں کے اقدار اور جس ملک سے وہ آئے ہیں' کی اقدار کی روشنی میں ہونی چاہیے۔

نوجوان مسلمان خواتین کے بارے میں میرا مشاہدہ یہ ہے کہ وہ اکثر اپنے والدین کی مرضی کے خلاف حجاب کرتی ہیں۔ مغرب میں آباد ہونے والی پہلی مسلمان نسل کا اسلام پر اعتماد کم تھا۔ وہ مغرب سے بہت مرعوب تھے۔ نئی نسل مختلف وجوہ کی بناء پر اسلام کی طرف زیادہ مائل ہے۔ بڑی عمر کی تعلیم یافتہ خواتین حجاب نہیں کرتیں مگر ان کی نوجوان اور جدید تعلیم یافتہ لڑکیاں بہت سختی سے حجاب کرتی ہیں۔ اس لیے یہ کہنا غلط ہے کہ مسلمان لڑکیاں والدین کے دباؤ میں آ کر حجاب کرتی ہیں۔

خلاصہ

درج بالا بحث سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مغربی معاشرہ جو انفرادیت' آزاد روی'

حقوق انسانی اور شخصی آزادی کا علمبردار ہے۔۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلم خواتین کو یہ قانونی حق نہیں دیتا کہ وہ اپنے مذہب و ثقافت پر شعوری عمل کر سکیں۔۔ تنوع (Diversity) کے دعویٰ کے باوجود یکسانیت کے لیے مجبور کرتا ہے۔ مسلمان ایک عالمگیر امت ہونے کے ناطے نسلی تحفظ کے قوانین سے بھی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔۔ اسی طرح وہ ان بین الاقوامی قوانین کی حفاظت سے بھی فی الحال محروم ہیں جس کی بنیاد پر مغرب مسلمان ممالک کے خلاف شب و روز منفی پروپیگنڈہ کرتا ہے، مگر مسلمان خواتین کی ہمت اور عظمت کے سبب حجاب مغرب میں عام ہو رہا ہے۔ اب بھی نوجوان اور اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان بچیوں کو حجاب شروع کرنے پر فیشن ایبل سٹورز سے نکال دیا جاتا ہے مگر آہستہ آہستہ عدالتوں نے ملازمت کے ضمن میں انہیں کچھ تحفظ دینا شروع کر دیئے ہیں۔ انشاء اللہ وہ وقت دور نہیں جب مسلمان خواتین اپنے ضمیر کے مطابق اپنی ثقافت پر مکمل طور پر عمل پیرا ہو سکیں گی۔

◖◗ ◖◗ ◖◗

تعارف مصنف

ظفراللہ خان نے قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد سے ایم ایس سی انٹرنیشنل ریلیشنز اور انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد میں اڑھائی سال تدریس کرنے کے بعد 1987ء میں سول سروس (ڈسٹرکٹ مینجمنٹ گروپ) میں شمولیت اختیار کرلی۔ 1995ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے برطانیہ چلے گئے' جہاں انہوں نے سٹی یونیورسٹی لندن سے ایل ایل بی' یونیورسٹی آف ویسٹ آف انگلینڈ برسٹل سے قانون میں پوسٹ گریجوایٹ ڈپلومہ اور لنکنز ان (لندن) سے 1998ء میں بارایٹ لاء کیا۔ موصوف آج کل ناظم بلدیہ ملتان کے طور پر خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

ظفراللہ خان